(غلام گردش)

وقت کا قافلہ

ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی موجودگی کافی رعب دار تھی۔لمبی لمبی سفید داڑھی اور ماتھے پر محراب کا نشان۔سادہ سے کُرتے شلوار میں ملبوس کون تھا۔میرے لئے انتہائی مشکل سا سوال تھا۔ذہن میں سوچنا شروع کیا کہ ہو نہ ہو بزرگ اپنے کسی چھوٹے بھائی کے ساتھ کھانے پر آیا ہوگا۔دعوت، ڈویژنل پبلک سکول لائل پور (فیصل آباد) کے ایک ہم جماعت نے دی تھی۔پرانے دوست بلکہ بہت ہی زیادہ پرانے دوست۔لاہور میں مقیم تمام احباب شامل تھے اور زاہد اسلم لائل پور سے آیا ہوا تھا۔مجبور ہو کر میزبان سے پوچھا کہ شیخ قیصر نہیں آیا۔سوال سن کر خاموش سا ہوگیا۔بتانے لگا کہ تمہارے ساتھ شیخ قیصر تو بیٹھا ہوا ہے۔میں حیران سارہ گیا۔قیصر اتنا بوڑھا کیسے ہوگیا۔اتنا بزرگ انسان۔اپنے سوال کا خود ہی ذہن سے جواب آیا کہ تم بھی تو بوڑھے ہو چکے ہو۔واقعی بہت بوڑھے۔

قیصر سے ملاقات چار دہائیوں کے بعد ہوئی۔انتہائی کامیاب کاروباری شخص ہے۔چھ ٹیکسٹائل ملوں کا مالک۔مزاج وہی بچپن کا۔انتہائی سادہ انسان۔چالیس سال کی برف یک دم پگھل گئی۔تمام بزرگ، بچے بن گئے۔پانچویں یا چھٹی کلاس کے طالبعلم۔ایسے لگا کہ سکول یونیفارم پہن کر اچھے بچوں کی طرح اپنے سکول میں بیٹھے ہیں۔بیٹھے بیٹھے ہی زندگی گزر گئی پتہ ہی نہیں چلا۔انجم گلزار بلا کا مہمان نواز انسان ہے۔اسے صرف موقع چاہیے تمام دوستوں کو اکٹھا کرنے کا۔یہ فن اسے ورثہ میں ملا ہے۔خیر ضیافت میں ایسے ایسے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن کو ذہن تقریباً فراموش کر چکا تھا۔لیکن زاہد اسلم ان میں سے نہیں۔زاہد سکول کے زمانے سے ایک لیڈر ٹائپ کا طالبعلم تھا۔مگر سیاسی بھی نہیں تھا اور نہ ہی سماجی لیڈر۔کس قسم کا قائد تھا، اسکا جواب صرف خود ہی دے سکتا ہے۔مگر لیڈر ضرور تھا۔ہم جماعت ہونے کے علاوہ جناح کالونی کا مکین تھا۔والد، اسلم صاحب، مقامی سیاست میں کافی فعال تھے۔مگر توجہ کے ساتھ کاروبار کرنے والے تاجر۔زاہد اسلم بھی لائل پور میں کامیاب ترین کاروباری شخص ہے۔چیمبر کا صدر بھی رہا ہے۔مگر میں جس زاہد کو جانتا ہوں، اسکو بہت کم لوگ پہنچانتے ہیں۔دس بارہ برس پہلے لائل پور میں سرراہے ملاقات ہوئی تو پرانی سی گاڑی چلا رہا تھا۔غضب کی گرمی میں اے۔سی کے بغیر قدیم سی کار۔اتنی سادگی بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔بلکہ اکثر لوگوں کے پاس سادگی جیسی بڑی دولت ہوتی ہی نہیں۔جیسے ہی کوئی شخص امیر ہوتا ہے، بڑی گاڑی، بڑا گھر اور ذاتی محافظوں کی قطار۔مگر زاہد اکیلا پھرتا ہے۔کسی گن مین کے بغیر۔ظاہری وضع قطع سے کوئی قیافہ نہیں لگا سکتا کہ کتنا صاحب ثروت ہے۔پرانے لوگ اسی طرح کے ہیں۔اپنے آپ میں مگن۔کام میں مصروف۔جتنا کامیاب ہے، اتنا ہی خاموش ہے۔بالکل برعکس آج کل لوگ اپنی دولت کا سہارا لیکر اپنے سے کمتر لوگوں کا مذاق اُڑانا برحق سمجھتے ہیں۔آپکو اشاروں کنایوں میں بتا دیتے ہیں کہ انکے پاس نئے ماڈل کی لینڈ کروزر ہے اور ایکڑوں پر محیط فارم ہاؤس میں رہتے ہیں۔یہی رویہ رائج الوقت ہے۔لوگ اپنی نیکی اور پارسائی کو بھی ہر جگہ کیش کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔کوئی شعبہ بھی مستثناء نہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ سفید پوش طبقہ کہاں جائے، کیا کرے اور کیسے سانس لے۔

کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ لائل پور کو فیصل آباد کیوں لکھتا ہوں۔اسلئے کہ میرے لئے فیصل آباد قدرے اجنبی سا شہر ہے۔مگر لائل

پور کے ساتھ ذہنی طور پر جڑا ہوا انسان ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ سعودی فرنروا شاہ فیصل کی شہادت پر لائل پور کا نام تبدیل کیا گیا۔شروع میں تو پورا نام شاہ فیصل آباد لکھا گیا۔نام کی تختیاں کئی بسوں کی پیشانی پر آویزاں ہوتی تھیں۔پھر سرکاری اختصار کی خاطر شاہ کا لفظ ہٹا دیا گیا۔عجیب بات ہے کہ طاقتور لوگ زندگی کے سفر کے اختتام پر بھی کمزور طبقے کی اصل شناخت تک تبدیل کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔میری نظر میں دنیا میں تقسیم صرف اور صرف ایک بنیاد پر ہے۔کون کمزور ہے اور کون طاقت کے گھوڑے پر سوار ہے۔خوبصورت گھوڑے کے سوار کے ہاتھ میں دولت کی تلوار خود بخود آ جاتی ہے۔بغیر کسی تردد کے۔مذہب کی بنیاد پر تقسیم دیکھتا ہوں تو سوال ذہن میں آتا ہے کہ مغربی دنیا میں جاتے ہی تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر کیسے ہو جاتے ہیں۔لندن میں کسی بھی دیسی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے کوئی نہیں پوچھتا کہ اس کا باورچی مسلمان ہے یا ہندو ہے،سکھ ہے یا عیسائی۔سب اطمینان سے کھانا کھا کر روانہ ہو جاتے ہیں۔نیویارک میں سٹور سے ضرورت کی چیزیں خریدتے ہوئے، بنانے والی کمپنی کے لوگوں کا مذہب،کوئی دریافت نہیں کیا جاتا۔یہ بھی نہیں پوچھتا کہ سٹور کا مالک کون سے دین سے تعلق رکھتا ہے۔کاؤنٹر پر کون کھڑا ہے۔پھر آجکل سیکولر اور مذہبی تفریق پر بحث شدت سے جاری ہے۔دونوں طرف دلائل کے انبار ہیں۔سوال ہے کہ کیا مذہبی انسان اپنے ذاتی رویہ میں سیکولر نہیں ہوسکتا۔کیا سیکولر آدمی پانچ وقت نماز نہیں پڑھ سکتا۔تاریخی اعتبار سے انسانی تقسیم کی بنیاد ضعف اور طاقت کے فلسفہ پر ہے۔انسانوں کو کسی اور بنیاد پر جانچنا مشکل سے مشکل تر ہو چکا ہے۔لیکن ہمارے جیسے ملکوں میں مذہبی تقسیم اور اسکو بڑھاوا دینے والے زبردست تجارتی ذہن رکھتے ہیں۔کہاوتیں اور قدیم لوریاں سنا کر لوگوں کو سوال کرنے کی طاقت سے ہی محروم کیا جا چکا ہے۔ہم سے اصل نکتہ چھپایا جا رہا ہے۔مبالغہ کی بنیاد پر ہمارے ذہن برباد کیے جا رہے ہیں۔خیر اس سنجیدہ موضوع کو کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھتا ہوں۔میرا اصل موضوع لائل پور،اپنا سکول اور پرانے ہم جماعت ہیں۔

سکول میں جاوید بھی میرا ہم جماعت تھا۔ڈاکٹر بن کر لائل پور کے نزدیک اپنا کلینک چلا رہا ہے۔چار دہائیوں میں اس سے صرف دو بار بات ہوئی۔اس درجہ شرارتی اور ذہین طالبعلم تھا کہ خدا کی پناہ۔سنجیدہ سے سنجیدہ بات کرتے ہوئے ایسی شکل بنا لیتا تھا کہ سامنے والا بے اختیار قہقہے لگانا شروع کر دیتا تھا۔کئی نظموں کو ایسا مزاحیہ پیراہن پہنا دیتا تھا کہ سننے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔آج بھی اسکی ایک حرکت یاد ہے۔کلاس میں ٹیچر بلیک بورڈ پر لکھنے میں مصروف تھے۔انکی پشت کلاس کی جانب تھی۔جیسے ہی استاد محترم کچھ لکھنا شروع کرتے تھے،جاوید اگلی سیٹ سے ہماری طرف منہ کر کے اتنی مزاحیہ شکل بنا لیتا تھا کہ بچے ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتے تھے۔شور سن کر جیسے ہی استاد کلاس کی طرف مڑتے تھے۔جاوید انتہائی عاجزی سے بلیک بورڈ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔استاد اس سے پوچھتے تھے کہ کیا ہوا۔سارے کیوں ہنس رہے ہیں۔جاوید انتہائی معصومانہ شکل بنا کر جواب دیتا تھا کہ اسے کچھ نہیں پتہ۔جیسے ہی دوبارہ استاد محترم بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کرتے تھے،دوبارہ ایسی ہی مزاحیہ شکل بنا لیتا تھا۔کسی دن ضرور جاوید کے پاس جانا چاہتا ہوں۔چند منٹوں کیلئے۔زندگی کے سنجیدہ رخ کو چند لمحوں کیلئے غیر سنجیدہ کرنے کیلئے۔بے اختیار قہقہے لگانے کیلئے۔شائد سانس لینے کیلئے!

سکول میں ایک عجیب سا الیکشن ہوتا تھا۔ہماری کلاس سے ایک مستقل امیدوار الیکشن لڑتا تھا۔یہ کس چیز کا الیکشن تھا یہ بالکل بے

معنی تھا۔مگر ہماری جماعت کا ایک امیدوار بالکل مستعد اور مستقل تھا۔شارق، ہاں، اسکا نام شارق تھا۔الیکشن سے کچھ دن پہلے ایک کالے رنگ کا بریف کیس سکول لاتا تھا۔ڈبہ سے اپنے نام کا کارڈ نکالتا تھا اور تقسیم کرنا شروع کرتا تھا۔درسگاہ میں مشہور تھا کہ ہر الیکشن میں ناکام ہونا شارق کیلئے اسی طرح لازم تھا، جس طرح ہوم ورک کرنا یا کلاس میں پڑھنا۔جس مسلسل استقامت سے شارق ہر الیکشن میں بطور امیدوار کھڑا ہو جاتا تھا، وہ اپنی جگہ پر ایک کارنامہ تھا۔شارق، الیکشن اور ہار تقریباً لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ہم سارے اسکو ہر بار بغیر مانگے ووٹ دیتے تھے اور نتیجہ کا انتظار کیے بغیر واپس چلے جاتے تھے۔نتیجہ سب کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا تھا۔حد تو یہ تھی کہ اگلے دن شارق بغیر کسی تردد کے آرام سے کلاس میں بیٹھا ہوتا تھا اور ہم جیسے ووٹر اس سے قطعاً نہیں پوچھتے کہ بھٹی کیا ہوا۔رسمی سا افسوس تک نہیں کرتے تھے کہ شارق، ہارنے پر بہت افسوس ہوا۔عجیب سی زندگی تھی۔کسی تکلف کے بغیر۔سچے اور ایماندار جذبے سے معمور۔اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ آج کی زندگی اصل ہے یا بچپن کا زمانہ حقیقت تھا۔میرے پاس اس درجہ مشکل سوال کا کوئی جواب نہیں۔زندگی بذات خود ایک ایسا محیر العقول گھورکھ دھندا ہے جسکی شروعات اور اختتام تو ہے مگر درمیان میں سب کچھ کیا ہے، یہ ایک دھندلا سا سوال ہے۔کسی جواب کے بغیر۔شائد کسی سوال کے بغیر۔ایک قافلہ سا ہے جسکے مسافر بالکل نہیں جانتے کہ سفر میں کون کون شامل ہے اور کب سفر ختم ہو جائیگا۔قافلہ بھی وقت کی گرد میں چھپا ہوا ہے۔

کلاس میں ایک طالبعلم تھا۔اسکا رنگ گندمی سے بھی گہرا تھا۔کافی حد تک سیاہی مائل۔ایک بچہ کہنے لگا کہ اس نے موبل آئل دیکھا تھا۔وہ بھی سیاہی مائل سا تھا۔اس مخصوص وقت سے اس بچہ کا نام موبل آئل پڑ گیا۔پھر بگڑ کر موبل لائٹ بن گیا۔پھر کسی منچلے نے اسکے ساتھ کرنل کا لفظ لگا دیا۔چنانچہ اب وہ پورے سکول کیلئے کرنل موبل لائٹ تھا۔اصل نام سب بھول چکے تھے۔پورے سکول میں کوئی اسکا اصل نام نہیں جانتا تھا۔موبل لائٹ تمام بچوں کو فخر سے اپنا نیا نام بتاتا تھا۔اس نے یہ زحمت بھی چھوڑ ڈالی تھی کہ اپنا خاندانی نام کسی کو بتائے۔اپنا سکول کا دیا ہوا نام سنکر ہنسنا شروع کر دیتا تھا۔اب کرنل موبل لائٹ لکھ رہا ہوں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی ہے مگر آنکھ میں پانی سا اُتر آیا ہے۔موبل لائٹ کہاں ہے، مجھے بالکل نہیں معلوم۔وہ کس شہر یا ملک میں ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔میرے لئے وہ جہاں بھی ہے جس حال میں بھی ہے، ہنستا مسکراتا کرنل موبل لائٹ ہے۔خدا اسے خوش وخرم رکھے۔آباد رکھے۔

بریک یا آدھی چھٹی کے وقت سکول کی کینٹین پر کافی رش ہو جاتا تھا۔چار آنے کی کوکا کولا کی بوتل اور دو آنے کا سموسہ۔یعنی چھ آنے میں ایک پوری تفریح۔کسی بھی بچہ کے پاس آٹھ آنے سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔عجیب سی کینٹین تھی۔ہجوم، آوازوں اور کھانے کی چیزوں سے بھرپور۔بریک میں ہی گراؤنڈ میں مٹی کے چبوترے کے اردگرد کمال کی جنگ ہوتی تھی۔زاہد اور شکیل چبوترے پر قبضہ کر لیتے تھے اور باقی اسکو چھڑوانے کی کوشش کرتے تھے۔یہ کافی غیر مہذب قسم کا وقت ہوتا تھا۔کیونکہ اب ہم سارے بابے ہیں، کئی تو اتنے باریش ہیں کہ انہیں پہچانا ہی نہیں جا سکتا، لہذا اس بریک کی تمام گفتگو کالم ضبط تحریر نہیں کر سکتا۔یہ کھیل ہفتے میں چار پانچ بار مسلسل وقوع پذیر ہوتا تھا۔گھنٹی کی آواز پر ختم ہو کر کلاسوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔کلاس میں جا کر بنچوں پر بیٹھ کر ایسے لگتا تھا کہ شائد بریک ہوئی ہی نہیں!

میرے سامنے پڑے ہوئے کافی کے گرم کپ سے دھواں نکل رہا ہے۔اس لکیر کو غور سے دیکھ رہا ہوں۔لگتا ہے کہ وقت، دھواں اور بچپن سب کچھ آپس میں تحلیل ہو گئے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کوئی خواب تھا۔شائد میں سکول گیا ہی کبھی نہیں!

راؤ منظر حیات

Dated: 29 July 2016